Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 7, Issue 1
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com
*Rsearch Article*

**ڈاکٹر عبدالواجد تبسم**
اسسٹنٹ پروفیسر اردو شعبہ پاکستانی زبانیں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

## فرحت اللہ بیگ کی خاکہ نگاری

**Dr Abdul Wajid Tabassum**
Assistant Professor,Department of Urdu,Pakistani Languages Allama Iqbal Open university,Islamabad

## Sketch Writing of Farhatullah Baig

**Received:** Jan 04, 2026
**Accepted**: Jan 20 2026
**Published**: Mar 30, 2026

Farhatullah Baig is considered one of the earliest sketch writers in Urdu literature. He played an important role in introducing and developing sketch writing in the Urdu literary tradition. A sketch is an important genre of Urdu prose in which a vivid portrait of a person is drawn through the significant events of his or her life. In this regard, his sketches *"Nazir Ahmad Ki Kahani Kuch Meri Aur Kuch Un Ki Zabani"* and *"Ek Wasiyat Ki Takmeel"* demonstrate his mastery of the art of sketch writing. In these sketches, he has portrayed the personal lives and literary achievements of the renowned Urdu figures Deputy Nazir Ahmad and Maulvi Wahiduddin Saleem with such skill that a complete picture of their personalities emerges before the reader's eyes. This article presents a critical review of these sketches.

**Keywords**: Farhatullah Baig, Urdu literature, sketch writing, Deputy Nazir Ahmad, Maulvi Wahiduddin Saleem

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اردو ادب کی متعدد اصناف پر طبع آزمائی کی اور یکساں مہارت سے لکھا مگر ان کی تحریروں میں ''ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی''، ''دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ'' اور ''پھول والوں کی سیر''— کو جو پذیرائی حاصل ہوئی وہ کسی دوسری تحریر کے حصے میں نہیں آئی۔ ''نذیر احمد کی کہانی'' سوانحی خاکہ ہے۔

خاکہ کے لیے انگریزی میں sketch کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ خاکہ نگار کسی ماہر مصور کی طرح کسی بھی شخص کی زندگی کے اہم واقعات میں سے انتخاب کرتا ہے کہ جن سے زیر خاکہ شخصیت کی ایک مکمل تصویر سامنے آجائے۔ ان واقعات کے پس پردہ اس انسان کی تلاش مقصود ہوتی ہے، جو خوشی سے خوش اور غموں سے غم زدہ ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا چلتا پھرتا انسان ہے جس میں ایک عام انسان کے سے خصائص ہوتے ہیں۔ چنانچہ واقعات کے انتخاب میں خاکہ نگار کو عام طور پر کسی بھی شخصیت کے محاسن و معائب کے ساتھ ساتھ ایسے واقعات کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے کہ جو ہر دو کے زمرے میں نہ آتے ہوں۔ بقول پروفیسر شمیم حنفی:

''خاکہ نگاری اور سوانحی مضمون یا اس قسم کی تحریر جس میں کسی شخص کی ادبی، تہذیبی، فنی، سیاسی، سماجی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہو... ان میں بہت سے لکھنے والے فرق نہیں

کرتے، خاکہ نگاری نہ تو سوانحی مضمون ہے نہ زندگی کے کسی شعبے میں موضوع بننے والی شخصیت کے کارناموں کی تفصیل۔"(1)

بقول خلیق انجم خاکہ ایک مشکل فن تحریر ہے۔اسے نثر میں غزل کا فن کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس میں غزل کی طرح طویل مضامین بیان کئے جاتے ہیں اور مختصر الفاظ میں ساری شخصیت پر روشنی ڈالنی پڑتی ہے۔(2)

خاکہ، سوانح سے اس حوالے سے مختلف ہے کہ اس میں خاکہ نگار کی توجہ چند واقعات پر مرتکز ہوتی ہے جو شخصیت کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔خاکے میں واقعات کے انتخاب سے ایسی تصویر کھینچی جاتی ہے جو ادھوری نہ ہو بلکہ ہمہ گیر اور متحرک ہو۔اس حوالے سے دیکھا جائے تو خاکہ ایک تخلیقی صنف کی صورت میں سامنے آتا ہے کہ جس میں زیر خاکہ شخصیت کے حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ خاکہ نگار کا ذاتی مشاہدہ اور تخیل بھی کارفرما ہوتا ہے۔پروفیسر شمیم حنفی کے خیال میں خاکہ نگاری کی ایک لازمی خوبی یہ ہے کہ خاکہ نگار اور جس کا خاکہ لکھا جا رہا ہو، وہ شخصیات دونوں ایک دوسرے سے قریب دکھائی دیں۔(3)

اُردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدائی صورتیں تذکروں میں ملتی ہیں۔اٹھارہویں صدی کے وسط سے جب تذکرہ نگاروں نے اردو شعرا کے حالات وواقعات بیان کیے تو جابجا ان شعرا کی شخصیات اور واقعات کے بھی دھندلے دھندلے نقوش ابھارنے کی کوشش کی، البتہ باقاعدہ صنف کے طور پر خاکہ نگاری کی ابتداء فرحت اللہ بیگ سے ہوتی ہے کہ جنھوں نے ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی وحید الدین سلیم کے بے مثال خاکے لکھے جو ہر حوالے سے خاکہ نگاری کے بنیادی اصولوں پر پورے اترتے ہیں اور ان کی اردو ادب میں مثال کم ہی ملے گی۔"ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی" اردو ادب کے سہ ماہی رسالے "اردو"، اورنگ آباد کی جولائی ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں منظر عام پر آیا۔یہ خاکہ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی فرمائش پر لکھا گیا اور بعد ازاں کتابی صورت میں اس کے متعدد ایڈیشن سامنے آتے رہے ہیں۔اس کی بنیادی وجہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے انداز بیاں کی وہ ندرت ہے جو ان ہی کا خاصا ہے۔انھوں نے نذیر احمد سے ملاقات، ان کے حلیے، گھر کی حالت، وقت کی پابندی، خوش خوراکی، کاروبار کے شوق، ابتدائی زندگی کے حالات، تعلیم، پڑھنے پڑھانے کا طریقہ، علمیت، برمحل گفتگو اور صاف گوئی تک کے واقعات کو اتنے پرلطف انداز میں بیان کیا ہے کہ یہ خاکہ نذیر احمد کی زندگی کا ایک چلتا پھرتا نمونہ بن گیا ہے۔مرزا فرحت اللہ بیگ نے جہاں ان کی عملی زندگی میں محنت، تگ ودو اور کوشش اور علمیت کی تعریف کی ہے وہاں ان کی زندگی کے کمزور پہلوؤں کو کچھ اس انداز سے دکھایا ہے کہ یہ خاکہ خالصتاً ایک انسان کے خاکے کے روپ میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

خاکے کے آغاز ہی میں انھوں نے یہ طے کر لیا ہے کہ وہ واقعات کے بیان میں کوئی سلسلہ قائم نہیں کریں گے۔بناوٹ کو تحریر میں داخل نہیں ہونے دیں گے، جو کچھ انھوں نے سنا دیکھا اسے جوں کا توں بیان کر دیں گے اور نذیر احمد کی زبان سے بیان کریں گے۔جھوٹ کی آمیزش نہیں ہونے دیں گے اور متانت کو بالائے طاق رکھ دیں گے کیونکہ بقول ان کے "مولوی صاحب جیسے خوش مذاق آدمی کے حالات لکھنے میں متانت کا کیا دخل"۔فرحت اللہ بیگ اور میاں دانی(4) کی نذیر احمد سے ملاقات بی اے کے زمانہ میں اس وقت ہوئی جب انھیں عربی پڑھنے کے لیے کسی استاد کی ضرورت محسوس ہوئی اور انھوں نے مولوی ضیاالدین اور نذیر احمد سے اسے پڑھنا چاہا مگر اول الذکر نے صاف انکار کر دیا۔البتہ نذیر احمد کو انھوں نے کسی نہ کسی طریقے سے راضی ہی کر لیا۔اس تمام واقعے کو انھوں نے نہایت پرلطف انداز میں بیان کیا ہے۔فرحت اللہ بیگ نے اس خاکے کا آغاز نذیر احمد کے حلیے سے کیا ہے اور اس میں انھوں نے نذیر احمد کی جو تصویر کشی کی ہے وہ کمال کی ہے:

"رنگ سانولا مگر روکھا، قد خاصہ اونچا تھا مگر چوڑان نے لمبان کو دبا دیا تھا، دہرا بدن گدرا ہی نہیں بلکہ موٹاپے کی طرف کسی قدر مائل۔۔۔۔۔کمر کا پھیر ضرورت سے زیادہ تھا۔ توند اس قدر بڑھ گئی تھی کہ گھر میں ازار بند باندھنا بے ضرورت ہی نہیں تکلیف دہ سمجھا جاتا تھا، اور محض ایک گرہ کو کافی خیال کیا گیا تھا۔۔۔۔۔۔۔سر بہت بڑا تھا مگر بڑی حد تک اس کی صفائی کا انتظام قدرت نے اپنے اختیار میں رکھا تھا، ۔۔۔۔۔داڑھی بہت چھدری تھی، ایک ایک بال بآسانی گنا جا سکتا تھا۔۔۔۔۔۔۔داڑھی کی وضع قدرت نے خود فرنچ فیشن بنا دی تھی۔"

یہ تو نذیر احمد کا حلیہ ہو گیا۔اس کے بعد ان کے گھر اور باہر کے لباس اور گھر کی حالت کا ایسا نقشہ کھینچا گیا ہے، جس سے ان کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے تمام حالات وواقعات آنکھوں کے سامنے آنے لگتے ہیں۔بقول ان کے اگر انہیں گھر سے نکلنا نہ پڑتا تو شاید لباس کی مد کے اخراجات ان کی فہرست سے نکل جاتے کیونکہ ان کے گھر اور باہر کے لباس میں زمین آسمان کا فرق تھا۔وہ جب کسی محفل میں شرکت کرتے تو عام طور پر شالی رومال، کشمیری جبہ یا ایل ایل ڈی کے گون میں نظر آتے۔شام کو ترکی ٹوپی یا چھوٹا سفید صافہ اور گرمیاں ہوتیں تو نہایت صاف شفاف سفید اچکن یا کشمیری کام کا جبہ ہوتا۔پاؤں میں سلیم شاہی جوتا اور وقت بے وقت کے دو انگریزی جوڑے جبکہ گھر میں ان کی حالت یکسر مختلف ہوتی:

''خدا کے فضل سے ان کے جسم پر کوئی لباس ہی نہیں ہے جس کا تذکرہ کیا جائے۔ نہ کرتا ہے نہ ٹوپی نہ پجامہ۔ ایک چھوٹی سی تہمد برائے نام کمر سے بندھی ہوئی ہے۔ بندھی ہوئی نہیں محض لپٹی ہوئی ہے لیکن گرہ کے جنجال سے بے نیاز ہے۔''

مولوی صاحب کے گھر کا نقشہ بھی ہر قسم کے تکلف سے بے نیاز تھا۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ اگر مولوی صاحب سے یہ سوال کیا جائے کہ ''مولانا ایں چہ کار است کہ کردہ؟'' تو انشااللہ یہی جواب ملے گا کہ ''محتسب را درون خانہ چہ کار'' فرحت اللہ بیگ کے خیال میں اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ انھیں اپنے کاموں سے فرصت ہی نہ تھی۔ پڑھنے پڑھانے میں سارا دن گزر جاتا تھا۔ دوسرے بہت کم لوگ تھے جو انھیں گھر پر ملنے آتے تھے۔ ان میں زیادہ تر شاگرد ہوتے یا صاحب علم اور ایسے لوگ ظاہری لباس اور چکا چوند کو نہیں دیکھتے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھر کو اپنا سمجھتے تھے اور انھیں جس طرح آرام ملتا اسی طرح رہتے تھے۔ البتہ جب باہر نکلتے تو ''کھائے من بھاتا پہنے جگ بھاتا'' پر عمل کرتے۔ اصل عالم گھر پر تھے باہر نکل کر ظاہری عالم بن جاتے۔''

مرزا فرحت اللہ بیگ فن مصوری میں بھی مہارت رکھتے تھے اور اسے انھوں نے اپنے زمانے کے دہلی کے مشہور استاد عارف سے سیکھا تھا۔ اس معاملے میں وہ قدیم آرٹ کے دلدادہ تھے۔ مگر رنگ آمیزی اس انداز سے کرتے تھے کہ تصویر کے خطوط ہر حوالے سے واضح ہوتے اور عام برش کی بجائے گلہری کی دم سے برش بناتے۔ مصوری کے شوق نے ان کے مضامین اور خاکوں میں رنگ بھرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ چنانچہ انھوں نے نذیر احمد کے حلیے اور گھر کا ایسا دلآویز منظر کھینچا ہے کہ اس کے پس منظر میں نذیر احمد ایک جیتے جاگتے انسان کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ بقول ڈاکٹر عبدالہ صدیقی:

''مرزا فرحت اللہ بیگ ایک تو مضمون نگار دوسرے شاعر تیسرے سونے پر سہاگہ یہ کہ مصور۔ غرض کہ مضمون نگاری میں ان کو اس فن میں کافی مدد ملی۔ وہ مضمون لکھتے یا کسی شخصیت کا خاکہ بناتے وقت سرسری طور پر نہیں گزر جاتے تھے بلکہ ان کی مصورانہ نظریں تاریک اور روشن پہلوؤں کا جائزہ لے کر ان کو اجاگر کرتی تھیں۔ تصویر کے دونوں رخ ان کی عمیق نظروں سے اوجھل نہیں رہنے پاتے تھے"'(5)

اس خاکے کی سب سے اہم خصوصیت نذیر احمد کی شخصیت کا جامع تاثر ہے جو مرزا فرحت اللہ بیگ کے قلم سے ہم تک پہنچتا ہے جس میں وہ ایک عالم سے عام انسان تک چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔

اس کہانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نذیر احمد وقت کے پابند تھے۔ سردی، گرمی اگرچہ اس میں کچھ تغیر و تبدل کر دیتی تھی مگر انہیں جہاں پہنچنا ہوتا تھا اس میں ایک منٹ کا اتار چڑھاؤ نہ ہوتا تھا۔ ان کے اس نظام الاوقات سے تمام اساتذہ، دوست اور ملازم سب ہی واقف تھے۔ رہی بات کھانے کی تو بقول مرزا فرحت اللہ بیگ:

"پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے مگر مجھ کو ایک حسرت رہ گئی کہ کبھی شریک بعام نہ ہو سکا... کہتے بھی جاتے تھے بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزہ کا آم ہے مگر بندہ خدا نے کبھی یہ نہ کہا کہ بیٹا ذرا چکھ کر تو دیکھو یہ کیسا ہے۔ میں نے تو تہیہ کر لیا تھا کہ مولوی صاحب اگر جھوٹے منہ بھی شریک ہونے کو کہیں تو ہم سچ مچ شریک ہو جائیں۔''

نذیر احمد کو مسلمانوں میں تجارت پھیلانے کا شوق تھا اور کاروبار کے لیے اکثر بڑی بڑی رقمیں بھی دے دیتے۔ مگر سود کا تقاضا ضرور کرتے۔ اس میں انھیں اکثر خاصا نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا مگر باز نہ آتے۔ گرمی ہو یا سردی، دھوپ ہو یا بارش قرض داروں کے ہاں ان کا چکر نہ چھوٹتا تھا، حساب کتاب سے ان کا ناطقہ بند کر دیتے۔ البتہ اگر کوئی حالات کی وجہ سے دیوالیہ ہو جاتا تو معاف بھی کر دیتے۔ مگر اصل حقیقت سامنے آنے پر معافی کی گنجائش بھی نہ رہتی۔ زیر نظر کتاب میں مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس طرح کا واقعہ بیان کیا ہے، جہاں انھوں نے قرض دار کو نالش کر کے حساب کتاب بے باق کیا۔ جہاں تک سود کی بات ہے تو وہ اسے لینا جائز سمجھتے تھے اور تاویلیں بھی دیتے تھے۔ بقول مرزا فرحت اللہ بیگ:

''سود لینا وہ جائزہ سمجھتے تھے۔ اگر کوئی حجت کرتا تو مارے تاویلوں کے اس کا ناطقہ بند کر دیتے۔ ایک تو حافظ دوسرے عالم، تیسرے لسان، بھلا ان سے کون در آسکتا تھا۔''

یہ خاکہ نذیر احمد کی زندگی کے ابتدائی حالات کو بخوبی واضح کرتا ہے۔ ان کا ابتدائی زمانہ بہت تنگی ترشی میں گزرا۔ پنجابیوں کے کٹڑے کی مسجد میں ٹھہر کر معلقات پڑھنے کے علاوہ چھبڑی ہاتھ میں لے کر گھر گھر سے روٹیاں جمع کرتے۔ مسجد کے پاس عبدالخالق صاحب کے ہاں مصالحے پیستے، ان کی بیٹی جو بعد ازاں ان کی زوجیت میں آئیں ہاتھ روکنے پر بٹہ انگلیوں پر مار دیتیں۔ اپنی محنت کے بل بوتے پر دہلی کالج میں داخل ہوئے اور وظیفہ بھی ملا۔ غرض ان کا ابتدائی زمانہ سخت مشقت اور تکلیف میں گزرا۔ مگر انھوں نے ہمت نہ ہاری بلکہ اپنی حقیقت پسندی، مستقل مزاجی اور صبر واستقلال سے غیر معمولی کامیابیاں بھی حاصل کیں۔ اس ماحول نے ان پر کچھ منفی اثرات بھی مرتب کیے تھے جو ان کی شخصیت کا جزو بن گئے تھے۔ ان میں بخل سر فہرست تھا۔ وہ خارجی معاملات میں منطقی، عمل پسند اور لین دین کے معاملے میں سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ

صاف گو، محنتی، ذہین، حاضر دماغ اور عزم صمیم کے مالک تھے۔ اس کے علاوہ دوست داری بھی ان میں بدرجہ اتم تھی۔ حالات سے سمجھوتہ کرنے میں بھی وہ ید طولی رکھتے تھے۔ ان کی گفتگو برمحل اور مزاح سے بھرپور ہوتی تھی۔ اگرچہ اس میں طنز کی گہرائی پائی جاتی تھی مگر زہرناکی کی بجائے مزاح کا پہلو زیادہ تھا۔

نذیر احمد کے پڑھانے کا انداز بھی منفرد اور الگ تھا۔ شعر خوانی کے بعد وہ میاں دانی سے صرف ونحو پر بحث کرتے، معانی بیان کرتے، نکات بتاتے پھر اس مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ شروع کرتے۔ اس مرحلے پر فرحت میدان میں آجاتے، انگلستان کے شعرا اور فلسفیوں کے مقولے بھی شامل ہو جاتے۔ اس حوالے سے کوئی واقعہ یا قصہ نذیر احمد پر گزرا ہوتا تو وہ بھی بیان ہو جاتا غرض ایک شعر کی تشریح پر آدھ آدھ گھنٹہ صرف ہو جاتا۔

کہانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نذیر احمد میں ترجمہ کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور وہ اس پر ناز بھی کرتے تھے۔ ان کے تراجم کا شہرہ بھی ہوا مگر اس کے برعکس وہ کلام مجید کے ترجمے کو اپنی تمام زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے۔ فرحت اللہ بیگ نے اس کہانی میں ان کے طرز تحریر کے بارے میں لکھا ہے کہ نذیر احمد کو اپنی نثر میں محاورے برتنے کا حد سے بڑھا ہوا شوق تھا۔ تحریر ہو یا تقریر وہ عبارت میں محاورت کو ٹھونستے رہتے تھے۔ جس سے تحریر کا لطف جاتا رہتا تھا اور روانی میں بھی کمی آجاتی تھی۔

نذیر احمد کو ترجمے پر مہارت اس لئے حاصل تھی کہ وہ متعدد زبانیں جانتے تھے اور جہاں ایک زبان کے لفظ سے مطلب ادا نہ ہوتا وہاں دوسری زبان کا لفظ برتتے۔ ''تعزیرات ہند'' کو وہ اپنا اہم کارنامہ قرار دیتے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ لکھتے ہیں:

''ان کے ترجمہ میں خوبی یہ ہوتی تھی کہ لفظ کی جگہ لفظ بٹھاتے تھے۔ لیکن وہ لفظ ہوتا تھا کہ وہاں نگینہ بن جاتا تھا۔ تعزیرات ہند کا ترجمہ اٹھا کر دیکھو وہی لفظ پر لفظ ہے۔ معنی بھی پورے دیتا ہے اور اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتا۔ سینکڑوں کتابوں کے ترجمے ہوئے دوسری اشاعت میں کچھ اور تیسری میں کچھ کے کچھ ہو گئے لیکن تعزیرات ہند کا ترجمہ جوں کا توں ہے۔ ایک لفظ ادھر سے ادھر نہیں ہوا۔ کہا کرتے تھے کہ ''تعزیرات ہند کا ترجمہ بھی میرا ایک کارنامہ ہے۔''

نذیر احمد نے مسلمان عورتوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس عہد کی عورتیں جدید تعلیم سے محروم تھیں اور اس کے نتیجے میں نئے تصورات سے ان کے اذہان خالی تھے۔ طرح طرح کی فرسودہ رسومات راہ پا گئی تھیں۔ بیٹے کے لیے ''چند پند'' اور بیٹی کے لیے ''مراۃ العروس'' لکھ کر انھوں نے نہ صرف جدید قصہ کہانی کی طرح ڈالی بلکہ اس کے پس پردہ عورتوں کی تعلیم کی ضرورت، فضول رسم ورواج اور جاہلانہ رسموں کے خاتمے میں بھی اپنا کردار ادا کیا۔ ان کا انداز بیان اتنا پر لطف ہے کہ قصے کی دلچسپی کا عنصر آخر تک برقرار رہتا ہے۔

نذیر احمد کی گفتگو برمحل ہوتی تھی۔ بقول فرحت: ''مولوی صاحب کو وقت پر ایسی سوجھتی تھی کہ باید وشاید... اس تیزی طبع کے ساتھ صاف گوئی بھی بلا کی تھی جو کہنا ہوتا تھا وہ کہے بغیر نہ رہتے تھے۔''

نذیر احمد کی کہانی کو غیر معمولی بنانے میں فرحت اللہ بیگ کے انداز تحریر نے بھی کمال دکھایا ہے۔ اس میں سرفہرست ان کی واقعہ نگاری ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کی اس طرح تصویر کشی کرتے ہیں کہ اس سے مزاح کا پہلو از خود پیدا ہونے لگتا ہے۔ انھوں نے اس خاکے میں واقعات کا انتخاب کچھ اس انداز سے کیا ہے کہ نذیر احمد کی زندہ تصویر آنکھوں کے سامنے آنے لگتی ہے اور اس میں ساکن کی بجائے حرکت کا پہلو نمایاں ہے۔ فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی ابتدائی مفلوک الحالی سے لے کر صاحب کمال ہونے تک کا نقشہ کچھ اس انداز سے کھینچا ہے کہ نذیر احمد کی زندگی کے تقریباً سبھی پہلو واضح ہوئے ہیں۔ ان واقعات کے بیان میں فرحت اللہ بیگ نے مزاح کے کسی روایتی حربے سے کام نہیں لیا بلکہ واقعات کو اس ترتیب سے بیان کیا کہ مزاح پیدا ہونے لگتا ہے اور قاری ایک طرح کی شگفتگی محسوس کرتا ہے۔ فرحت اللہ بیگ کی تمام تحریروں میں بالخصوص مزاح کا پہلو نمایاں ہے اور نذیر احمد کی کہانی لکھتے ہوئے بھی ان کے ہاں غالب پہلو یہی ابھرتا ہے۔ تمہید میں لکھتے ہیں:

''سینو میٹو گراف کا یہ فلم چڑھانے سے قبل میں اپنے طرز بیان کے متعلق معافی مانگ لیتا ہوں کیونکہ میری شوخی بعض جگہ حد تجاوز سے بڑھ جائے گی لیکن آپ تمام قارئین کرام کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر مولوی صاحب خود اپنی سوانح عمری لکھتے تو اسی رنگ میں لکھتے۔''

اس کہانی میں خوش طبعی کا رنگ بھرنے میں نذیر احمد کی طبیعت نے بھی اپنا اثر دکھایا ہے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی خوش مذاقی کے متعدد واقعات اس کہانی میں بیان کیے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے مولوی صاحب کے لیے ''ہنسوڑ'' کا لفظ برتا ہے۔ وہ موقع محل کے مطابق ایسا جملہ چست کرتے کہ لوگ عش عش کر اٹھتے۔ ہندو کالج کے طالب علم رضا جو فرحت اللہ بیگ کے ساتھ عربی پڑھنے نذیر احمد کے پاس گئے اور جب شعر کو نثر بنا دیا تو بجائے اس کہ اس کی ڈانٹ ڈپٹ کرتے انھیں مشورہ دیا کہ:

’’بھئی رضا میں یہ نہیں کہتا کہ میرے یہاں آنا ہی چھوڑ دو۔ میں تم کو بھی ضرور پڑھاؤں گا مگر تم دس پندرہ روز شام کے وقت کالی جان (طوائف) کے ہاں تعلیم میں ہو آیا کرو۔ اتنے دنوں کے آنے جانے میں تمہارے کانوں کو نظم و نثر کا فرق معلوم ہونے لگے گا۔ بھئی مجھ سے تو شعروں کے گلے پر چھری پھیرتے دیکھا نہیں جاتا۔‘‘

اس خاکے سے ہی ہم پر نذیر احمد کی طبیعت کی شوخی، خوش مذاقی اور شگفتہ بیانی واضح ہوتی ہے۔ اگر یہ خاکہ ہمارے سامنے نہ ہوتا تو کوئی کیونکر ان کی طبیعت سے واقف ہو سکتا تھا۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کے انداز بیان کی سب سے اہم خوبی محاورے کی بجائے روز مرے سے کام لینا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کی عبارت میں سادگی اور روانی پیدا ہوئی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ انھوں نے محاوروں کو سرے سے برتا ہی نہیں ہے۔ انھیں جہاں محاورے کی ضرورت محسوس ہوئی انھوں نے اسے بھی برتا ہے مگر ہر دو کا امتزاج اس طرح کا ہے کہ تحریر میں بوجھل پن نظر نہیں آتا۔ وہ محاوروں کی بھرمار سے تحریر کو بے لطف نہیں کرتے، بلکہ انھوں نے الفاظ کی نشست برخاست اور واقعات کی ترتیب سے ایک ایسا آمیزہ تیار کیا ہے کہ ہر دو ایک دوسرے کا لازمی جزو معلوم ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر رشید حسن خان لکھتے ہیں:

"ان کے (فرحت اللہ بیگ) یہاں یہ دوری مٹ گئی ہے۔ بیان کا اسلوب اور واقعات کی ترتیب یہ ان کے ہاں یک جان نظر آتے ہیں۔ ( 6 )

اس کہانی میں مزاح پیدا کرنے میں فرحت اللہ بیگ نے الفاظ کی ترتیب اور نشست برخاست سے بھی کام لیا ہے۔ اس میں ان کی زبان دانی نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ اہل زبان تھے اور اُردو زبان کے روز مرے اور محاورے پر انھیں دسترس حاصل تھی۔ ان کے بعض جملے لائق تحسین ہیں۔

’’پہلو میں حقہ، اس کی حقیقت کما حقہ بیان کرنا مشکل ہے۔‘‘

’’خوش خوراک تھے اور مزے لے لے کر کھانا کھاتے تھے... پڑھاتے جاتے تھے اور کھاتے جاتے تھے۔ کہتے بھی جاتے تھے بھئی کیا مزے کا خربوزہ ہے۔ میاں کیا مزہ کا آم ہے؟
"

مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس کہانی کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا۔ ان کے مضامین سات جلدوں کو محیط ہیں۔ دیگر متفرق تحریریں ان کے علاوہ ہیں مگر جو شہرت۔’’نذیر احمد کی کہانی‘‘ اور ’’ایک وصیت کی تعمیل‘‘ کے حصے میں آئی وہ کسی اور کو نہ مل سکی۔ ’’ایک وصیت کی تعمیل‘‘ مولوی وحید الدین سلیم کا خاکہ ہے۔ یہ خاکہ ’’اُردو‘‘ اورنگ آباد، جنوری ۱۹۲۹ء اور نیرنگ خیال لاہور کی بالترتیب اپریل۔ مئی ۱۹۲۹ء کی دو اشاعتوں میں قسط وار شائع ہوا۔

اس کی شان نزول یہ ہے کہ نذیر احمد کا خاکہ مولوی وحید الدین سلیم کی نظر سے گزرا اور ان کے دل میں گھر کر گیا بارہا ملنا چاہا مگر ملاقات نہ ہو سکی۔ ہوئی بھی تو کہاں حیدر آباد کے ریلوے اسٹیشن پر کہ جہاں ہر دو حضرات مولوی عبدالحق کی دعوت پر اورنگ آباد کالج کے سالانہ جلسے کی تقریبات میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ کہ ان کی ملاقات مولوی وحید الدین سلیم سے ہوئی۔ انھوں نے ان کے نذیر احمد کے خاکے کی تعریف کی اور کہا کہ کاش کے کوئی ہمیں بھی ایسا شاگرد ملتا جو مرنے کے بعد ہمارا حال بھی لکھتا۔ اس پر فرحت اللہ بیگ نے کہا آپ مر جایئے مضمون میں لکھ دوں گا۔ لکھتے ہیں: اس ملاقات کا منظر کچھ یوں کھینچا ہے:

"کیا خبر تھی کہ سال بھر کے اندر ہی اندر مولوی صاحب مر جائیں گے اور مجھے ان کی وصیت کو پورا کرنا پڑے گا۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ مولوی وحید الدین سلیم ہیں تو واقعی مجھے بہت پشیمانی ہوئی۔ میں نے معذرت کی، وہ خود شگفتہ طبیعت لے کر آئے تھے، رنج تو کجا بڑی دیر تک ہنستے اور اس جملے کے مزے لیتے رہے۔‘‘

فرحت اللہ بیگ نے اسی وصیت کی تعمیل میں یہ خاکہ لکھا ہے۔ اس خاکے میں بھی فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی جیسا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ نذیر احمد اور مولوی وحید الدین سلیم کی زندگی میں کئی قدریں مشترک ہیں۔ ایک یہ کہ ہر دو نے سخت محنت اور تگ و دو سے زندگی میں کامیابیاں حاصل کیں۔ دوسرے ہر دو کی ذاتی زندگی اسی طرح تنگی ترشی میں گزری مگر جب ان کے پاس مال و دولت کی ریل پیل ہوئی تو ان کی ذاتی زندگی کا ناک نقشہ ویسے کا ویسے ہی رہا۔ بخل دونوں کی شخصیت میں بدرجہ اتم موجود تھا۔ دونوں لیکچر دینے میں کمال رکھتے تھے۔ دونوں تراجم میں مہارت رکھتے تھے مگر نذیر احمد عربی زبان و ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی ماہر تھے، جبکہ مولوی وحید الدین سلیم انگریزی بالکل نہیں جانتے تھے مگر اس کے باوجود انگریزی اصطلاحات پر حاوی تھے۔ ہر دو شخصیات کا ذاتی زندگی کے برعکس علمی وقار اور مرتبہ بہت بلند ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے اس خاکے میں مولوی صاحب کے حلیے، ذاتی اور اجتماعی زندگی کے علاوہ ان کی طبیعت اور علمی وقار کا کچھ ایسا نقشہ کھینچا ہے کہ مولوی وحید الدین سلیم کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کی ایک متحرک تصویر سامنے آتی ہے۔ چند جملوں سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے:

''ادھر ریل چلی ادھر ان کی زبان چلی۔ رات کے بارہ بجے ایک بجا۔ دو بج گئے۔ مولوی صاحب نہ خود سوتے ہیں اور نہ سونے دیتے ہیں۔''

''ان میں ظرافت کا مادہ بہت تھا لیکن یہ ظرافت اکثر رکاکت کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔''

''ان کا بدل ملنا دشوار تو کیا ناممکن ہے۔ عربی اور فارسی میں اچھی دسترس تھی مگر وہ اردو کے لیے بنے تھے اور اردو ان کے لیے۔ خوب سمجھتے اور سمجھاتے تھے۔ زبان کے جو نکات وہ اپنے شاگردوں کو بتا گئے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ کالج کے لونڈے وہ مضمون لکھ جاتے ہیں جو بڑے بڑے اہل قلم کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آتے۔ مولوی صاحب کیا مرے، زبان اردو کا ایک ستون گر گیا اور ایسا گرا کہ اس جیسا ستون تو کجا۔ اس حصے میں اروڑ بھی لگانی مشکل ہے۔''

غرض اس خاکے میں بھی فرحت اللہ بیگ نے واقعات کی ترتیب کچھ اس انداز سے رکھی ہے کہ مولوی وحید الدین سلیم کی ذاتی اور اجتماعی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کا علمی وقار آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے، تاہم اس خاکے کو نذیر احمد کی کہانی کا ہم پلہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس کی نبیادی وجہ یہ ہے کہ اس خاکے میں وہ ایک خاکہ نگار اور مضمون نگار دونوں کے روپ میں سامنے آئے ہیں اور اس میں ہر دو اصناف کے عناصر یکجا ہو گئے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے نذیر احمد کو شاید بہت قریب سے دیکھا تھا اور ان کے ساتھ تعلق کی نوعیت بھی الگ تھی جو ''ایک وصیت کی تعمیل میں'' پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے باوجود مرزا فرحت اللہ بیگ نے اپنے بیان کی رنگینی اور شوخی طبع سے کوشش کی ہے کہ اس خاکے میں بھی وہی رنگ پیدا ہو جو ''نذیر احمد کی کہانی'' کا خاصا ہے۔

بحیثیت مجموعی دیکھا جائے تو فرحت اللہ بیگ نے دہلوی تہذیب کی پرانی اقدار اور ان میں موجود ان اشخاص کو جو اس تہذیب کا حصہ ہیں اپنے مرقعوں سے زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ عہد اس حوالے سے اہم ہے کہ قدیم دہلوی تہذیب بدلتے بدیسی تہذیبی عناصر سے بہ دست آمادہ تھی اور نت نئے تہذیبی رویے جنم لے رہے تھے۔

## حوالہ جات


۱۔ شمیم حنفی، پروفیسر، آزادی کے بعد دہلی میں اُردو خاکہ دہلی، اُردو اکادمی، ص۹

2۔ بحوالہ اُردو ادب میں خاکہ نگاری، مولفہ ڈاکٹر صابرہ سعید حیدر، مکتبہ شعر و حکمت، طبع اول، ۱۹۷۸ء، ص۹

3۔ غلام یزدانی، یادگار فرحت حیدر آباد دکن، فرحت میموریل کمیٹی، ۱۹۵۱ء، ص 13

4۔ غلام یزدانی، جو بعد میں حیدر آباد دکن میں ایک عرصہ تک، ڈائریکٹر محکمہ آثار قدیمہ رہے۔

5۔ عبدالحٰق صدیقی، ڈاکٹر، مرزا فرحت اللہ بیگ حیات وادبی خدمات، دہلی، نائس پرنٹنگ پریس، طبع اول، مئی ۱۹۸۹ء، ص 59

6۔ رشید حسن خاں، مرتب

ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی کچھ میری اور کچھ ان کی زبانی، نئی دہلی انجمن ترقی اُردو، ۱۹۹۲ ص ۱۷